یادیں بیتے دنوں کی

یہ تقریباً اس زمانے کی بات ہے جب پاکستانی اخبارات ڈاکے کو 'سرقہ بالجبر' اور عصمت دری یا آبرو لوٹ لینے کو 'زنا بالجبر' لکھا کرتے تھے۔ اس زمانے کے کارٹون اکثر پنڈت نہرو کا یا پنڈت نہرو اور شیخ عبداللہ کی کورٹ شپ کا خاکہ اڑایا کرتے تھے۔ زمانہ یہی کوئی پچاس اکاون کا بنتا ہے۔ ہم ان دنوں قائدِ اعظم کے مزار کے قریب قائد آباد کے نام سے بسی ہوئی جھگیوں میں سے ایک میں، تین نمبر چاند ماری کے پاس رہتے تھے اور ہمارا اسکول عین مزار قائد کے سامنے تھا۔ اس اسکول کے متعلق یہ کہنا مشکل ہے کہ پرائمری تھا، مڈل تھا یا سیکنڈری تھا، بہر حال کچھ بھی تھا اسکول تھا اور ہماری نظر میں اس اسکول سے بدرجہا بہتر تھا جو کہ ابا جی مرحوم نے اس لئے ہمارے شایانِ شان جانا تھا کہ یہ بڑی سی کوٹھی میں تھا۔ یہ کوٹھیاں مزار قائد کی پشت پر سڑک کے دوسرے پار تھیں اور اغلب خیال ہے کہ اب بھی ہونگی۔ خیر ہمارے لئے اس اسکول میں بڑی مشکلیں تھیں ایک تو یہ تھی کہ کوٹھی بہت دور تھی اور دوسری مشکل یہ تھی کہ ہم کو وہاں کچھ پڑھنا تو یاد نہیں لیکن اپنے ہم جماعتوں کیساتھ سیاسی مباحثات میں حصہ لینا خوب یاد ہے۔ مثلاً ہمارے ایک ساتھی طالب علم نے ارشاد فرمایا کہ قائداعظم مہاجر تھے۔ ہم گو کہ دہرے تہرے مہاجر ہو کر آئے تھے پر تھے مقامی۔ ہمارے جو پنجابی خون نے جوش مارا تو ہم نے بھی کہہ دیا" قائداعظم تے پنجابی تھے" (قائداعظم تو پنجابی تھے) اس پہ کچھ لپاڈگی بھی ہوگئی۔ شام کو جب ابا گھر آئے تو یہ مقدمہ ہم نے ان کے سامنے پیش کیا۔ ابا نے بتایا کہ قائداعظم سب کے تھے پنجابیوں کے بھی اور مہاجروں کے بھی ویسے وہ کراچی میں پیدا ہوئے تھے" ابا جی میری طرح"، ہم نے اپنی معلومات کا مظاہرہ کیا، "ہاں جی تمہاری طرح نواب صاحب" ابا نے ہمیں ایک ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا۔ پھر ابا جی کو کچھ خیال آیا پوچھا کہ کیا پڑھا آج۔ ہمارے منہ پر "وہ کیا ہوتا ہے جی؟" لکھا دیکھ کر ابا جی نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اونچی دوکان پھیکا پکوان اسکول ہمارے لئے بہر حال مناسب نہ تھا۔ خیر تو اس اسکول میں ہمیں داخل کروا دیا گیا جو کہ مزار قائد کے ٹیلے پر مزار کے عین سامنے تھا۔ یہاں بس ایک ہی مشکل پیش آئی وہ یہ تھی کہ ہم چونکہ اخبار وغیرہ فرفر پڑھ لیا کرتے تھے اس

لئے ابا نے ہمیں ہماری عمر کے مطابق تیسری جماعت میں داخل کروادیا۔ خیر تو سوائے اس کی کہ پہلے چند دن حساب کے پیریڈ میں ہمارے ہاتھ لال ہوتے رہے ہمارے ذہن میں اس اسکول کی اچھی یادیں ہی ہیں اور آج سوچا ہے کہ ان میں سے ایک یاد پر سے پردہ اٹھایا جائے۔ کیونکہ وہ واقعہ بے حد اہم تھا لیکن ہم نے باوجود اپنی تمام تر اخبار بینی اور رسالہ بینی کے اس واقعہ کا ذکر کہیں اشارتاً بھی نہیں پایا۔ لیکن اس واقعہ کو بیان کرنے سے پہلے تھوڑا سا تعارف ضروری ہے ہمارے ہیڈ ماسٹر ظہیر الدین نام کے ایک نوجوان تھے مناسب سے ذرا نکلتا ہوا قد، تیکھے نقوش اور گندمی سے ذرا کھلتا ہوا رنگ۔ اب اگر ان خصوصیات کے نوجوان سے ملاقات ہو جائے رشک کے سوا شاید کوئی جذبہ دل میں نہ آئے۔ پر صاحب اس زمانے میں ہم ظہیر الدین صاحب کو بڑی دھانسو شخصیت جانتے تھے گو کہ حساب کے زبانی سوالوں کی ایسی ایسی ڈرل کروایا کرتے تھے کہ دانتوں پسینے چھوٹ جایا کرتے تھے۔ شروع شروع میں انہوں نے بھی ہمارے ہاتھ لال کئے تھے پر اس کے باوجود آدمی شاندار تھے اگر پارٹیشن کے حادثے کا شکار نہ ہوئے ہوتے تو مجھے یقین ہے کہ بہت اہم شخصیت ہوتے بلکہ یقین ہے کہ تھے کیونکہ انکے اسکول میں چند ماہ کا پڑھا ہوا ایک عرصے تک کام آیا۔

خیر تو ہم اس اسکول میں اس شاندار ہیڈ ماسٹر کی زیرِ نگرانی پڑھ رہے تھے کہ اکتوبر ۱۹۵۱ آ گیا اور لیاقت علی مرحوم کی شہادت کا واقعہ ہو گیا ایک دکھ کی لہر تھی جو مہاجروں کی اس بستی میں دوڑ گئی اس دکھ کی لہر کو کچھ وہی محسوس کر سکتا ہے جس نے لیاقت علی کی تقریروں کو سن کر خود اعتمادی کی لہر دوڑتی محسوس کی ہو، خیر تو مرحوم کا جنازہ آیا قائداعظم کے مزار والے ٹیلے کو کچھ اور بڑا اور کشادہ کیا گیا اور مزار کے باہر ایک طرف لیاقت علی خان کو دفن کیا گیا۔ اس بات پر بستی کے تقریباً باسی دکھی تھے۔ ان سب کا خیال یہ تھا کہ لیاقت علی خان قائداعظم کی زندگی میں انکے دستِ راست تھے پھر قائداعظم کی وفات کے بعد انہی نے پاکستان کو سنبھالا اب وفات کے بعد قائد ملت کو قائداعظم کے پہلو میں دفن ہونا چاہیئے تھا۔ خیر جہاں تک تدفین کا تعلق تھا وہ معاملہ تو غالباً فوج کے ہاتھ میں تھا ہو گیا سو ہو گیا اب بستی والوں کا خیال تھا کہ کم از کم دیوار تو نہ ہو دونوں مزاروں کے درمیان۔ اس وقت لیاقت علی کا مزار کیا تھا بس ایک قبر تھی جس پہ شامیانہ تنا ہوا تھا دن رات لاؤڈ سپیکر پر قرآن خوانی ہوتی رہتی تھی۔ خیر تو ماسٹر ظہیر الدین اور چند اور لوگوں نے عرضداشت پیش کی۔ ظاہر ہے کہ کچھ سیاسی شخصیات بھی اس معاملے میں دلچسپی رکھتی ہوں گی

پر خدا شاہد ہے کہ ہم کو علم نہیں، ہوتا بھی کیسے ہم تو تھے ہی بہت چھوٹے۔ اس عرضداشت کا جواب نفی میں ہی آیا ہوگا، جبھی تو اگلے روز ایک خاصہ بڑا اجتماع ہوا، ماسٹر ظہیر الدین صاحب کی سرکردگی میں، مزاروں پر کچھ نعرے بھی لگے جن میں نمایاں یہ تھا 'اس دیوار کو توڑ دو' مراد تھی دونوں مزاروں کے درمیان والی دیوار۔ خیر مس فاطمہ جناح آئیں، خوب گرج برس کر گئیں۔ ہم تو بہت دور تھے، کچھ سن نہ پائے پر انداز کچھ ڈانٹنے کا سا تھا۔ غالباً بیگم رعنا لیاقت بھی اپنی روئی روئی آنکھوں کیساتھ آئیں۔ اکثر آیا کرتی تھیں ان دنوں۔ یہ یاد نہیں کہ اس روز بھی آئی تھیں یا نہیں۔ خیر تو بات ہو رہی تھی ہنگامے کی اور اجتماع کی۔ بات کسی طرح بھی پٹتی نہ دیکھ کر ماسٹر ظہیر الدین کو جوش آ گیا انہوں نے کدال ہاتھ میں لے کر ہلا بول دیا۔ پھر کیا تھا اور لوگ بھی پل پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے دیوار کا ایک بڑا حصہ منہدم ہو گیا اور آنے جانے کا رستہ بن گیا۔ اس کے بعد خاصی دیر تک نعرے لگتے رہے پھر شام کے قریب جب ماسٹر ظہیر الدین کا اپنا گلا بھی بیٹھ گیا تو ہجوم کچھ کم ہوا۔ اس واقعے کے کچھ ہی عرصے کے بعد ہم کراچی چھوڑ کر شکار پور چلے گئے۔ اسکے بعد کراچی میں رہے بھی اور کراچی گئے بھی کچھ اس لئے کہ کراچی ہماری جنم بھومی ہے اور کچھ اس لئے کہ ہوائی جہاز کے سستے ٹکٹ اکثر کراچی سے ہو کر جاتے ہیں یا ان کی شرط یہ ہوتی ہے کہ کراچی بھی جاؤ لیکن ہماری کم نصیبی کہہ لیں یا بے حسی کہ مزار قائد پر کبھی حاضری نہ دی۔ اصل بات یہ ہے کہ جب قریب تھے تب چھوٹے اتنے تھے کہ کوئی جانے نہ دیتا تھا اور پھر بعد میں جب ہوش آئی تو شرم آتی تھی کہ ہم لوگوں نے جو حال پاکستان کا کیا ہے اس حال میں قائد کے پاس کیا منہ لے کر جائیں۔ خیال ہے کہ وہ دیوار پھر بن گئی تھی لیاقت علی خان کا مزار بھی پکا ہو گیا ماسٹر ظہیر الدین کا کوئی ذکر اذکار کہیں نہ سنا بلکہ انکا بھانجا یاسین ہمارا ہم جماعت تھا بڑا اچھا گلا پایا تھا اس نے۔ ہمیں منظوم کلام سے ذرا بھی رغبت نہیں (ذوق کا کلام غالب کے سر تھوپ کر غالب کے خلاف اپنا بغض نکالنے میں ہم فرد ہیں) اس کے باوجود ایک مصرع اسکی پاٹ دار آواز میں اب بھی کانوں میں گونجتا ہے

کسی مرتے کو اسے بیداد گر مارا تو کیا مارا

ایک بار یہ سوچ کر کہ شاید ان لوگوں کا کوئی پتا مل جائے تو ایک بار مل لیا جائے ان اطراف میں گئے تو پتا چلا کہ اب اس قائد آباد کا کوئی وجود باقی نہیں۔ جھگیوں میں بسنے والے لوگوں کو مختلف بستیوں میں کوارٹر الاٹ ہو گئے۔ اور وہ لوگ قائدوں کے

مزاروں کو چھوڑ کر چلے گئے۔

سوچتا ہوں کہ آج اگر ایسا واقعہ پاکستان میں ہو جائے تو شاید گولی چل جائے۔ پر بھلے دن تھے کم از کم ہم نے تو مزاروں پہ پہرہ دینے والے سنتریوں کے سوا کوئی پولیس والا نہ دیکھا۔ کراچی کے (اور پاکستان کے) موجودہ حالات کے پیش نظر یہ واقعہ ایک لمحۂ فکریہ ہے حکومت کیلئے بھی اور ان لوگوں کیلئے بھی جو گولی کا جواب گولی سے (گولی چلائے جانے سے پہلے) دینے کو تیار رہتے ہیں۔

اظہار تشکر: عزیزم ڈاکٹر ظفر وقار نے ہمارے ایک بہت پرانے مسودے کو پڑھا، سمجھا، اور چند ترامیم تجویز کرتے ہوئے ٹائیپ۔ کیا اللہ تعالےٰ انکو جزائے خیر دے۔

ڈاکٹر محمد ظفر اللہ

Pocatello, Idaho, USA